سُوْرَۃُ الضُّحٰی

اس سورۃ مبارکہ کے مضامین پر غور کرنے سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ یہ مکی دور کے شروع میں نازل ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور جو لوگ آپ پر ایمان لائے انہیں انتہائی مصائب ومشکلات کا سامنا تھا، قریش مکہ نے دعوتِ حق کو روکنے میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی اور اہل ایمان پر ظلم وستم کی انتہا کر دی۔ بعض اوقات صحابہ کرام رضی اللہ عنھم اس قدر دل گرفتہ ہو جاتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر ظلم وجور کی داستانیں سناتے، آپ انہیں صبر واستقامت کی تلقین کرتے، اس پر رب کریم نے نبی رحمت صلی اللہ علیہ وسلم پر یہ سورۃ مبارکہ نازل فرمائی اور اس میں آپ کو ایک طرف یہ تسلی دی کہ جس طرح رات میں پھیلی ہوئی تاریکی آفتاب کے طلوع ہوتے ہی چھٹ جاتی ہے، اسی طرح یہ ناسازگار حالات جس میں آپ اور آپ کے اصحابؓ وقتی طور پر گھرے ہوئے ہیں، بالآخر چھٹ کر رہیں گے، پریشانیوں اور مخالفتوں کا یہ طوفان ختم ہو جائے گا اور حق وصداقت کا آفتاب پوری تابانی سے چمک کر رہے گا جس کا مشاہدہ اہل دنیا نے فتح مکہ پر کر لیا۔ دوسری طرف آپ کو اور آپ کے اصحابؓ کو ابدی راحت اور دائمی کامیابی کی بشارت بھی سنائی گئی کہ یہ دنیا عارضی اور فانی ہے، اس میں اگر تھوڑی بہت پریشانی ہے تو اس سے گھبرانے کی ضرورت نہیں ہے، آخرت میں آپ کے لیے لازوال اجر ہے۔

روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کچھ عرصہ کے لیے وحی کا سلسلہ منقطع ہوا تو مخالفین نے یہ اعتراض شروع کر دیا کہ آپ کا رب آپ سے ناراض ہو گیا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ نے آپ کو تسلی اور تشفی دی کہ نہ تو آپ کے رب نے آپ کو چھوڑا ہے اور نہ وہ آپ سے ناراض ہوا ہے بلکہ اپنی حکمت ومصلحت سے جب وہ چاہتا ہے آپ پر جبرئیل امین کے ذریعہ وحی نازل فرماتا ہے۔

سورۃ کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے اپنے احسانات کا ذکر فرمایا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیا میں یتیمی کی حالت میں آنکھیں کھولیں، تو رب رحیم نے آپ کی سرپرستی فرمائی آپ لوگوں کی زبوں حالی پر پریشان تھے اور نورِ ہدایت کے لیے مضطرب تھے تو ہادی مطلق نے آپ کے لیے روشنی کا سامان بہم پہنچایا اور قرآن حکیم ایسی عظیم کتاب سے آپ کو نوازا، لہٰذا آپ اور آپ کے اصحابؓ اس دعوتِ حق کو جاری وساری رکھیں اور رب تعالیٰ کے نام کو اونچا اور سربلند رکھیں، اس کے ساتھ ساتھ خدمت خلق کو اپنی زندگیوں کا شعار بنائیں......غربا ومساکین کی خدمت، یتامیٰ اور بیوگان کی سرپرستی، بے سہارا اور کمزور لوگوں کی اعانت، یہی زندگی کے وہ ارفع واعلیٰ مقاصد ہیں جس کے لیے انسان کو اشرف المخلوقات بنا کر اس دنیا میں بھیجا گیا ہے۔

آیات:۱۱ سُوۡرَۃُ الضُّحٰی رکوع:۱

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

﴿وَالضُّحٰی(۱) وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی(۲) مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی(۳) وَ لَلۡاٰخِرَۃُ خَیۡرٌ لَّکَ مِنَ الۡاُوۡلٰی(۴) وَلَسَوۡفَ یُعۡطِیۡکَ رَبُّکَ فَتَرۡضٰی(۵)﴾

گواہ ہے آفتاب کی روشنی اور گواہ ہے رات جب وہ ہر شے پر چھا جاتی ہے (اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) نہ تو آپ کے رب نے آپ کو چھوڑا اور نہ وہ آپ سے ناراض ہوا اور آپ کے لیے انجام (آخرت) ابتدا (دنیا) سے بہتر ہے اور عنقریب آپ کو آپ کا رب اتنا کچھ عطا فرمائے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔

﴿وَالضُّحٰی، وَالَّیۡلِ اِذَا سَجٰی﴾

گواہ ہے آفتاب کی روشنی اور گواہ ہے رات جب وہ ہر شے پر چھا جاتی ہے۔

وَ، قسمیہ ہے اور قسم بمعنی گواہی اور شہادت کے ہوتی ہے الضُّحٰی کے اصل معنی (طلوع آفتاب کے بعد) دھوپ پھیل جانے اور دن چڑھ آنے کے ہیں۔ (مفردات القرآن) وَ قسمیہ ہے، الَّیۡلِ رات کی، اِذَا جب، سَجٰی (وہ) چھا جائے (سَجَا، یَسۡجُوۡ، سَجۡوًا وَ سُجُوًّا) ٹھہرنا، پرسکون ہونا جیسے کہا جاتا ہے: سَجَا الۡبَحۡرُ سمندر پرسکون ہے، سَجَا الَّیۡلُ رات پرسکون ہے، (القاموس الوحید)

مولانا محمد عبدالحی لکھتے ہیں:

"اللہ تعالیٰ کی قدرت کے یہ نمونے ہر روز ہمارے سامنے آتے ہیں کہ ایک وقت رات ہوتی ہے، چاروں طرف گھپ اندھیرا چھایا ہوتا ہے، راستہ چلنے والوں کے لیے راستہ چلنا مشکل ہو جاتا ہے اور

بہت سے کام کرنے والے اپنا اپنا کام بند کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں، لیکن اس کے بعد سورج نکلتا ہے سارے اندھیرے غائب ہو جاتے ہیں، ہر چیز روشن ہو جاتی ہے، راستہ چلنے والے راہ پاتے ہیں، کام کرنے والے کام کرنے لگتے ہیں، یہ نظارہ جو ہر روز ہمارے سامنے آتا ہے، اس سے ہم ایک طرف تو اس بات کی طرف اشارہ پاتے ہیں کہ یہ پورا کارخانہ جس کی تدبیر کے تحت چل رہا ہے، وہ بڑی قدرت والا ہے، دوسرا اشارہ اس بات کی طرف بھی ملتا ہے کہ زمانے کا مزاج ہی یہ ہے کہ یہ ایک حال پر قائم نہیں ہے، یہاں کبھی اندھیروں کا راج ہوتا ہے اور کبھی اجالے کا، کبھی ایک طرح کے حالات سامنے آتے ہیں اور کبھی دوسری طرح کے، تو جب صورت حال یہ ہے تو پھر انسان اپنے حالات کے بارے میں یہ کیوں سمجھ لے کہ وہ کبھی نہ بدلیں گے؟ وہ کیوں اس بات کی امید نہ رکھے کہ اگر آج حالات کچھ سخت ہیں تو کل ضرور نرم ہو جائیں گے، آج اگر مشکلات کا سامنا ہے تو کل آسانیاں بھی آئیں گی۔

یہی بات ہے جس کی طرف ابتدائی دو آیتوں میں اشارہ کیا گیا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کو دوسری جگہ اس طرح فرمایا: اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْراً ''بلاشبہ ہر تنگی کے بعد آسانی ہے۔'' (آسان تفسیر)

﴿مَا وَدَّعَکَ رَبُّکَ وَمَا قَلٰی﴾

(اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم) نہ تو آپ کے رب نے آپ کو چھوڑا اور نہ وہ آپ سے ناراض ہوا۔

مَا نہ، مائے نافیہ، وَدَّعَکَ (وَدَّعَ. کَ) چھوڑا۔ آپ کو (وَدَّعَ، یُوَدِّعُ) چھوڑنا، قطع تعلق کرنا، رَبُّکَ (رَبُّ. کَ) رب۔ آپ کا، وَمَا اور نہ، وَ عاطفہ، مَا نافیہ، قَلٰی وہ ناراض ہوا، خفا ہوا۔ فعل ماضی واحد مذکر غائب (قَلٰی، یَقْلٰی، قِلًی) کسی کو ناپسند کرتے ہوئے چھوڑ دینا۔ (قاموس الوحید)

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

''اے محمد ﷺ! آپ کے رب نے جب سے آپ کو رسالت کے لیے چن لیا ہے اس نے آپ کو چھوڑا نہیں ہے اور نہ ہی وہ آپ سے ناراض ہوا جب سے اس نے آپ کو اپنی محبت سے نوازا ہے اور یہ بات مشرکین کی تردید میں ہے جب انہوں نے کہا کہ ان کے رب نے انہیں چھوڑ دیا ہے اور یہ قسم کا جواب ہے۔'' (صفوۃ التفاسیر)

تعجب ہے ان مشرکین پر جو ایک طرف تو یہ کہتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم جو کچھ پیش کر رہے ہیں وہ ان کا اپنا کلام ہے اور یہ بات جھوٹ ہے کہ ان پر وحی اللہ کی طرف سے آتی ہے تو دوسری طرف جب اس وحی کے آنے میں کچھ دیر ہوئی تو محض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل دکھانے کے لیے یہ طعنے دینے لگے کہ ان کے رب نے انہیں چھوڑ دیا ہے حقیقت یہ ہے کہ مخالفت انسان کو حق بات کہنے اور پہچاننے میں اندھا کر دیتی ہے۔

﴿وَ لَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى﴾

اور آپ کے لیے انجام (آخرت) ابتدا (دنیا) سے بہتر ہے۔

وَ اور، لَلْاٰخِرَةُ (لَ. اَلْاٰخِرَةُ) ضرور بضرور۔ آخرت۔ لام زبر والا تاکیدی معنی دیتا ہے، خَيْرٌ بہتر ہے، یہ لفظ اردو میں بھی یہی معنی دیتا ہے، لَّكَ (لَ. كَ) لیے۔ آپ کے، مِنَ سے، الْاُوْلٰى ابتدا (دنیا)۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

”اے محمد ﷺ! دارِ آخرت آپ کے لیے دنیا کی اس زندگی سے کہیں بہتر ہے اس لیے کہ آخرت ہمیشہ رہنے والی ہے جبکہ دنیا فانی ہے۔

اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرمایا کرتے تھے:

اَللّٰهُمَّ لَا عَيْشَ اِلَّا عَيْشَ الْآخِرَةِ ”اے اللہ! (اصل) زندگی تو آخرت ہی کی زندگی ہے۔“ (صفوۃ التفاسیر)

﴿وَلَسَوْفَ يُعْطِيْكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى﴾

اور عنقریب آپ کو آپ کا رب اتنا کچھ عطا فرمائے گا کہ آپ راضی ہو جائیں گے۔

وَ اور، لَسَوْفَ (لَ. سَوْفَ) ضرور بضرور۔ عنقریب، لام زبر والا تاکیدی معنی دیتا ہے، سَوْفَ، فعل مضارع کے شروع میں آتا ہے تو مستقبل قریب کے لیے خاص کر دیتا ہے، کبھی یہ وعید کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسا کہ قرآن حکیم میں آتا ہے: كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ”تم

کو پتہ چل جائے گا، جلدی تم کو پتہ لگ جائے گا۔'' اور کبھی یہ وعدہ کے لیے استعمال ہوتا ہے جیسا کہ ''لَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى'' (القاموس الوحید)

ڈاکٹر محمد لقمان السّلفی لکھتے ہیں:

''ہر آنے والا دن آپ کے لیے گزشتہ دن سے بہتر ہو گا، چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے درجات اللہ کی نگاہ میں بلند ہوتے رہے آپ کے دشمن مغلوب ہوتے گئے اور آپ کا دین غالب ہوتا گیا اور روز بروز آپ پر اللہ تعالیٰ کے انعامات واحسانات بڑھتے ہی گئے اور آپ کا مقام اونچے سے اونچا ہوتا گیا، یہاں تک کہ آپ اپنے رب کے نزدیک اس مقام پر فائز ہو گئے جو اولین وآخرین میں سے کسی کو نصیب نہیں ہوا اور آخرت میں جو مقام ملے گا اور جن نعمتوں سے آپ نوازے جائیں گے، ان کی تعبیر انسانی الفاظ میں ممکن نہیں، اسی لیے اللہ نے کہا ''وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضٰى'' اور عنقریب آپ کا رب آپ پر اپنے انعامات کی بارش کرے گا تو آپ راضی ہو جائیں گے۔ (تیسیر الرحمٰن لبیان القرآن)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت وبصیرت

۱) ان آیات مبارکہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنھم کے لیے ہی نہیں بلکہ قیامت تک تمام داعیان حق کے لیے شفقت ومحبت کا پیغام اور صبر واستقامت کی راہ پر چلنے والوں کے لیے روشن ہدایات ہیں، انہیں مصائب ومشکلات کو خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہوئے اپنے مشن کو اپنے رب کی رضا کے لیے جاری وساری رکھنا چاہیے، یہ مصائب اور دکھ فتح ونصرت کا پیغام دیتے ہیں اور اس دنیا کی عارضی تکالیف ابدی کامیابی کی نوید بنتی ہیں۔

۲) دنیا کی عارضی مشکلات تو بہرحال کٹ ہی جاتی ہیں مگر اس کا اجر اللہ تعالیٰ کے یہاں لازوال اور بے مثال ملتا ہے، دنیا کی ساری کلفتیں اور مصیبتیں جنت میں قدم رکھتے ہی ابدی نعمتوں اور آسانیوں میں بدل جائیں گی اور یہاں کے سارے دکھ اور غم وہاں پہنچتے ہی ابدی راحت وآرام میں تبدیل ہو جائیں گے۔ آمین!

....

﴿اَلَم یَجِدُکَ یَتِیۡمًا فَاٰوٰی(٦) وَ وَجَدَکَ ضَآلًّا فَھَدٰی(٧) وَ وَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغۡنٰی(٨) فَـاَمَّا الۡیَتِیۡمَ فَـلَا تَقۡھَرۡ(٩) وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنۡھَرۡ(١٠) وَ اَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثۡ(١١)﴾

(اے محمدؐ!) کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اس (رب العالمین) نے آپ کو یتیم پایا تو ٹھکانا بخشا اور آپ کو پریشان حال پایا تو سیدھا راستہ بتلا دیا اور نادار پایا تو غنی کر دیا، لہٰذا کسی یتیم پر سختی نہ کیجیے، اور نہ کسی سائل کو جھڑکیے، اور اپنے رب کے احسانات کو بیان کرتے رہیے۔

﴿اَلَم یَجِدُکَ یَتِیۡمًا فَاٰوٰی﴾

(اے محمدؐ!) کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اس (رب العالمین) نے آپ کو یتیم پایا تو ٹھکانا بخشا۔

اَ کیا، کلمہ استفہام، لَم نہیں، یہ حرف جزم ہے، فعل مضارع کے شروع میں آتا ہے تو نفی کا معنی دیتا ہے اور اسے ماضی کے معنی میں بدل دیتا ہے اور آخری لفظ کو ساکن کر دیتا ہے، جیسا کہ یذھَبُ، (وہ جاتا ہے یا جائے) گا سے لَمۡ یَذۡھَبۡ وہ نہیں گیا، اَلَمۡ یَجِدۡکَ کیا نہیں پایا آپ کو (وَجَدَ، یَجِدُ) پانا، اَلوِجُدان، شعور، جذبہ، ضمیر، ادراک اردو میں بھی جانا پہچانا لفظ ہے۔ ''ک''، ضمیر واحد مذکر حاضر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جاتی ہے، یَتِیۡمًا یتیم، معروف لفظ ہے، نابالغ بچے کا شفقت پدری سے محروم ہو جانا، انسان کے علاوہ دیگر حیوانات میں یُتۡم کا اعتبار ماں کی طرف سے ہوتا ہے اور جانور کے چھوٹے بچے کے بن ماں کے رہ جانے کو یتیم کہا جاتا ہے۔ (مفردات القرآن)، فَاٰوٰی تو اس نے ٹھکانا بخشا (ف. اٰوٰی) پس۔ اس نے ٹھکانا بخشا، ''ف'' عاطفہ سلسلہ کلام جاری رکھنے کے لیے ہے (اٰوٰی،

یُؤْوِی، اِیْواءً) ٹھکانا دینا، پناہ دینا ”مَأوٰی“ مرجع اور جائے پناہ کو کہتے ہیں۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

”یعنی آپ کو چھوڑ دینے اور آپ سے ناراض ہو جانے کا کیا سوال، ہم تو اس وقت سے آپ پر مہربان ہیں جب آپ یتیم پیدا ہوئے تھے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی بطن مادر ہی میں چھ مہینے کے تھے جب آپ کے والد ماجد کا انتقال ہو گیا، اس لیے آپ دنیا میں یتیم ہی کی حیثیت سے تشریف لائے مگر اللہ تعالیٰ نے ایک دن بھی آپ کو بے سہارا نہ چھوڑا، چھ سال کی عمر تک والدہ ماجدہ آپ کی پرورش کرتی رہیں، ان کی شفقت سے محروم ہوئے تو آٹھ سال کی عمر تک آپ کے جدّ امجد نے آپ کو اس طرح پالا کہ ان کو نہ صرف آپ سے غیر معمولی محبت تھی بلکہ ان کو آپ پر فخر تھا اور وہ لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ میرا یہ بیٹا ایک دن دنیا میں بڑا نام پیدا کرے گا، ان کا بھی انتقال ہو گیا تو آپ کے حقیقی چچا ابو طالب نے آپ کی کفالت اپنے ذمے لی، اور آپ کے ساتھ ایسی محبت کا برتاؤ کیا کہ کوئی باپ بھی اس سے زیادہ نہیں کر سکتا، حتیٰ کہ نبوت کے بعد جب ساری قوم آپ ﷺ کی دشمن ہو گئی تھی اس وقت دس سال تک وہی آپ کی حمایت میں سینہ سپر رہے۔“ (تفہیم القرآن، ج:٦)

﴿وَ وَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى﴾

اور آپ کو پریشان حال پایا تو سیدھا راستہ بتلا دیا۔

وَ اور، عاطفہ سلسلہ کلام کو جاری رکھنے کے لیے ہے، وَجَدَكَ (وَجَدَ. كَ) اس نے پایا۔ آپ کو، فعل ماضی واحد مذکر غائب۔ ”كَ“ ضمیر واحد مذکر حاضر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جاتی ہے، ضَآلًّا گم گشتہ راہ (پریشان حال)، فَهَدٰى (فَ. هَدٰى) تو۔ اس نے ہدایت عطا فرمائی اسلام کی سیدھی اور سچی راہ سے نوازا، قرآن حکیم ایسی کتاب عطا فرمائی اور نسل انسانیت کے لیے آپ کو ہادی اور رہنما بنایا۔

سید مودودیؒ لکھتے ہیں:

”اصل میں لفظ ضَآلًّا استعمال ہوا ہے، عربی زبان میں یہ لفظ کئی معنوں میں استعمال ہوتا ہے، اس

کے ایک معنی گمراہی کے ہیں، دوسرے معنی یہ ہیں کہ کوئی شخص راستہ نہ جانتا ہو اور ایک جگہ حیران (پریشان) کھڑا ہو کہ مختلف راستے جو سامنے ہیں ان میں سے کدھر جاؤں، ایک اور معنی کھوئے ہوئے کے ہیں چنانچہ عربی محاورے میں کہتے ہیں "ضَلَّ الْمَآءُ فِی اللَّبَنِ" پانی دودھ میں گم ہوگیا، اس درخت کو بھی عربی میں "ضَالَّۃٌ" کہتے ہیں جو صحرا میں اکیلا کھڑا ہو اور آس پاس کوئی دوسرا درخت نہ ہو، ضائع ہونے کے لیے بھی "ضلال" کا لفظ بولا جاتا ہے، مثلاً کوئی چیز ناموافق اور ناسازگار حالات میں ضائع ہورہی ہو، غفلت کے لیے بھی "ضلال" کا لفظ بولا جاتا ہے۔ چنانچہ خود قرآن مجید میں اس کی مثال موجود ہے کہ: لَا یَضِلُّ رَبِّیْ وَ لَا یَنْسَی (طٰہٰ:۵۲) میرا رب نہ غافل ہوتا ہے نہ بھولتا ہے، ان مختلف معنوں میں سے پہلے معنی یہاں چسپاں نہیں ہوتے کیونکہ بچپن سے قبل نبوت تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جو حالات تاریخ میں موجود ہیں ان میں کہیں اس بات کا شائبہ تک نہیں پایا جاتا کہ آپ کبھی بت پرستی، شرک یا دہریت میں مبتلا ہوئے ہوں یا جاہلیت کے جو اعمال، رسوم اور طور طریقے آپ کی قوم میں پائے جاتے تھے ان میں سے کسی میں آپ ملوث ہوئے ہوں، اس لیے لامحالہ "وَ وَجَدَکَ ضَآلًّا" کے معنی یہ تو نہیں ہوسکتے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو عقیدے یا عمل کے لحاظ سے گمراہ پایا تھا، البتہ باقی معنی کسی نہ کسی طور پر یہاں مراد ہوسکتے ہیں بلکہ ہوسکتا ہے کہ ایک ایک اعتبار سے سب مراد ہوں، نبوت سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی ہستی اور اس کی وحدانیت کے قائل تو ضرور تھے اور آپ کی زندگی گناہوں سے پاک اور فضائل اخلاق سے آراستہ تھی لیکن آپ کو دین حق اور اس کے اصول اور احکام کا علم نہ تھا جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے: مَا کُنْتَ تَدْرِیْ مَا الْکِتٰبُ وَ لَا الْاِیْمَانُ (الشوریٰ:۵۲) "آپ نہ جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور نہ ایمان کی آپ کو خبر تھی۔" یہ معنی بھی اس آیت کے ہوسکتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جاہلی معاشرے میں گم ہوکر رہ گئے تھے اور ایک ہادی و رہبر ہونے کی حیثیت سے آپ کی شخصیت نبوت سے پہلے نمایاں نہیں ہورہی تھی، یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ جاہلیت کے صحراء میں آپ ایک اکیلے درخت کی حیثیت سے کھڑے تھے جس میں پھل لانے اور ایک پورا باغ کا باغ پیدا کردینے کی صلاحیت تھی مگر نبوت سے پہلے یہ صلاحیت کام نہیں آرہی تھی، یہ مراد بھی ہوسکتی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو غیر معمولی قوتیں آپ کو عطا کی تھیں وہ جاہلیت کے ناسازگار ماحول میں ضائع ہورہی

تھیں، ''ضلال'' کو غفلت کے معنیٰ میں بھی لیا جا سکتا ہے یعنی آپ ان حقائق اور علوم سے غافل تھے جن سے نبوت کے بعد اللہ تعالیٰ نے آپ ﷺ کو آگاہ فرمایا، یہ بات خود قرآن میں بھی ایک جگہ ارشاد ہوئی ہے: وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ الْغٰفِلِيْنَ (یوسف:۳) اور اگر چہ آپ اس سے پہلے ان باتوں سے غافل تھے۔'' (تفہیم القرآن، ج:۶)

﴿وَ وَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى﴾ اور نادار پایا تو غنی کر دیا۔

وَ اور، عاطفہ، وَجَدَكَ (وَجَدَ. كَ) پایا۔ آپ کو، فعل ماضی واحد مذکر غائب، ضمیر واحد مذکر حاضر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف جاتی ہے، (وَجَدَ، يَجِدُ) پانا، عَآئِلًا نادار، مفلس (عَالَ، يَعِيْلُ، عَيْلًا) مفلس ہونا، نادار ہونا اس سے اسم فاعل عَآئِلًا مفلس، نادار، فَاَغْنٰى (فَ. اَغْنٰى) پس غنی کر دیا، اس نے (رب العالمین نے) اَغْنَى اللّٰهُ فُلَانًا اللہ تعالیٰ نے فلاں کو مالدار کر دیا، الْغِنٰى، مالداری، تمول، یہ لفظ اردو میں استعمال ہوتا ہے۔ ''اَلْغَنِيُّ'' مالدار، اللہ تعالیٰ کا صفاتی نام ہے، یعنی وہ کسی شے میں کسی کا محتاج نہیں ہے (کائنات میں) ہر ایک اس کا محتاج ہے۔ (القاموس الوحید)

حافظ صلاح الدین یوسف لکھتے ہیں:

''اَغْنٰى'' تونگر (مالدار) کا مطلب اپنے سوا آپ کو ہر ایک سے بے نیاز کر دیا، پس آپ فقر میں صابر اور غنیٰ میں شاکر رہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان بھی ہے: ''تونگری، ساز و سامان کی کثرت کا نام نہیں ہے، بلکہ اصل تونگری تو دل کی تونگری ہے۔'' اور اسی کی رحمت سے آپ غنی ہو گئے۔ ویسے بھی آپ نے اپنے چچا ابو طالب کے ساتھ سفر تجارت میں تجربہ حاصل کیا اور شادی سے پہلے خدیجہ رضی اللہ عنہا کے سامانِ تجارت کو امین تاجر کی حیثیت سے خوش اسلوبی کے ساتھ سرانجام دیا اور اس صالحہ خاتون سے شادی کے بعد بھی اس تجارت کی خود ہی نگرانی فرمائی جو اللہ کی رحمت سے پھلی پھولی۔'' (احسن التفاسیر)

﴿فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ﴾ لہٰذا آپ کسی یتیم پر سختی نہ کیجیے۔

فَاَمَّا (فَ. اَمَّا) لہٰذا۔ جو، الْيَتِيْمَ یتیم ہو، فَلَا تَقْهَرْ تو اس پر غصہ نہ کیجیے، فعل نہی واحد مذکر حاضر

(قَهَرَ يَقْهَرُ، قَهْرًا) کسی پر غالب ہونا، مغلوب کرنا، سختی اور غصہ کرنا۔

الاستاذ محمد علی الصابونی لکھتے ہیں:

''یعنی کسی یتیم کو حقارت کی نگاہ سے نہ دیکھیے اور نہ اس کے مال کو حاصل کیجیے، مجاہد کا قول ہے کہ یتیم کو نفرت اور حقارت سے نہ دیکھیے۔ سفیان کہتے ہیں ''یتیم کے مال کو ضائع کر کے اس پر ظلم نہ کیجیے۔'' اور اس سے مراد یہ ہے کہ یتیم کے ساتھ ایک مشفق اور مہربان والد کا سا برتاؤ کیجیے، آپ بھی یتیم تھے، تو اللہ تعالیٰ آپ کا آسرا بنا۔'' (صفوۃ التفاسیر)

﴿وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾ اور نہ کسی سائل کو جھڑ کیے۔

وَ اور، حرف عاطفہ، اَمَّا جو کوئی، لیکن، رہا یہ کہ...... یہ حرف شرط و تفصیل کہلاتا ہے، السَّآئِلَ (سَأل. يَسْئَلُ. سُؤَالٌ) پوچھنا، سوال کرنا، اس سے اسم فاعل سَآئِلٌ، پوچھنے والا (کوئی مسئلہ، سوال پوچھنے والا) اور مانگنے والا، حاجتمند، فقیر، گداگر۔ دونوں مفہوم اس لفظ میں ہیں۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

''وَ اَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ'' یہ اس انعام کا حق بیان ہوا ہے، جو اوپر ''وَ وَجَدَكَ ضَآ لًّا فَهَدٰى'' کے الفاظ میں بیان ہوا ہے۔ لفظ سائل، یہاں محدود معنی میں نہیں بلکہ وسیع معنی میں استعمال ہوا ہے خواہ سائل اپنے پیٹ اور تن کی کسی ضرورت کے تحت سوال کرے یا اپنی کسی ذہنی و عقلی الجھن سے متعلق سوال کرے یا اپنے دین سے متعلق سوال کرے، غرض جس طرح کی بھی مدد و رہنمائی کا طالب ہو حتی الامکان اس کی مدد و رہنمائی کی جائے اور اگر اس کا موقع نہ ہو تو خوبصورتی کے ساتھ اس کے سامنے معذرت پیش کر دی جائے، اُس کو جھڑکا اور ڈانٹا نہ جائے، مطلب یہ ہے کہ یہ بات یاد رکھنا کہ ایک دور تم پر بھی ایسا گزرا ہے جب تم سراپا سوال تھے اور ان سوالوں نے تمہاری زندگی ضیق [تنگی] میں ڈال رکھی تھی بالآخر تمہارے رب نے تمہاری ہر خلش دور فرمائی اور تمہارے ہر سوال کا جواب دیا، اس کا حق یہ ہے کہ تم بھی سائلوں کے ساتھ اچھا سلوک کرنا۔ ان لوگوں کی روش نہ اختیار کرنا جن کا حال یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اُن کو دے رکھا ہے تو مسکینوں اور سائلوں سے ترش روئی سے پیش آتے ہیں اور ابھی کسی گردش میں

اللہ اُن کو پکڑ لے تو کہیں گے کہ اللہ نے مجھے ذلیل کر دیا، اس وقت ان کو یہ بات یاد نہیں آتی کہ انہوں نے اللہ کے بندوں کو کس طرح ذلیل کیا ہے۔" (تدبر قرآن، ج:۸)

﴿وَ اَمَّا بِنِعۡمَةِ رَبِّکَ فَحَدِّثۡ﴾

اور اپنے رب کے احسانات کو بیان کرتے رہیے۔

وَ اور، عاطفہ، اَمَّا جو، بِنِعۡمَةِ نعمت (ہے) رَبِّکَ (رَبِّ. کَ) رب، آپ کا (یعنی اس کی طرف سے)، بِنِعۡمَةِ رَبِّکَ مضاف، مضاف الیہ ہیں ب نے نعمت کو زیر دی۔ رَبِّکَ بھی مضاف، مضاف الیہ ہے۔ فَحَدِّثۡ تو اسے بیان کیجیے، فعل امر واحد مذکر حاضر، فَ پس، (تو)، حَدَّثَ، يُحَدِّثُ بیان کرنا، "تحدیثِ نعمت" نعمت کے ملنے پر اس کا اعتراف کرنا اردو میں مستعمل ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی لکھتے ہیں:

"یہ اللہ تعالیٰ کے اس فضل و انعام کا حق بیان ہوا ہے جو اوپر "وَ وَجَدَکَ عَآئِلًا فَاَغۡنٰی" کے الفاظ میں بیان ہوا ہے ہم اس کی وضاحت کرتے ہوئے اشارہ کر چکے ہیں کہ اس سے وہ غنیٰ مراد نہیں ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بی بی خدیجہ رضی اللہ عنہا کے مال سے حاصل ہوا بلکہ اصلاً اس سے دین کی وہ حکمت اور شریعت کی وہ دولت مراد ہے جس کی شان قرآن میں یہ بیان ہوئی ہے کہ: وَ مَنۡ یُّؤۡتَ الۡحِکۡمَةَ فَقَدۡ اُوۡتِیَ خَیۡرًا کَثِیۡرًا (البقرہ:۲۶۹) "اور جس کو حکمت عطا ہوئی اس کو خیر کثیر کا خزانہ بخشا گیا۔" یہاں لفظ "فَحَدِّثۡ" خاص طور پر نگاہ میں رکھیے، یہ مال کی نعمت کے لیے نہیں بلکہ حکمت کی نعمت ہی کے لیے موزوں ہے، فرمایا کہ جس حکمت کے خزانے سے تمہارے رب نے تم کو بہرہ ور کیا ہے، اس کی تحدیث کرو، یعنی جس طرح تمہارے رب نے تمہیں مفت بخشا ہے، تم بھی اس کو مفت بانٹو، ہر آنے جانے والے کے سامنے اس کا چرچا کرو اور ہر بزم و انجمن کو اس کے ذکر سے معمور کر دو۔" (تدبر قرآن، ج:۸)

آیاتِ مبارکہ کی حکمت و بصیرت:

۱) رب کریم کے ان گنت انعامات میں سے اسلام ایسے پاکیزہ دین کی عطا، خاتم النبیین جناب محمد

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت، ان پر قرآن حکیم کا نزول اور ان کی حیات طیبہ ہے۔

۲) انبیاء علیہم السلام کی تعلیم وتربیت اور تزکیہ وطہارت کا سروسامان اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے، جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یتیمی کی حالت میں اس دنیا میں آنکھیں کھولیں، اللہ تعالیٰ نے ان کی نگہداشت اور تربیت کا عمدہ سامان فرمایا جیسا کہ حدیث مبارکہ میں بھی آتا ہے: اَدَّبَنِیُ رَبِّیُ فَاَحُسَنَ تَأدِیُبِی ''میرے رب نے میری تربیت فرمائی اور بہترین تعلیم وتربیت سے آراستہ فرمایا'' نور بصیرت سے مالا مال ہونا اتنا بڑا خزانہ ہے جس کے مقابلے میں دنیا کے سارے خزانے ہیچ ہیں۔

۳) اتنی بڑی نعمت ملنے کے بعد اس کے شکرانے کا طریق کار یہ ہے کہ بیوگان اور یتامیٰ کے ساتھ نرمی کے ساتھ محبت کا رویہ اختیار کیا جائے اور اس کے ساتھ ساتھ رب کریم کی عظمت اور بڑائی کا اعلان کیا جائے جس کے احسانات ان گنت اور جس کے انعامات بے پایاں ہیں۔

۴) امت مسلمہ اس قدر انعامات پانے کے بعد انہیں فراموش کر چکی ہے، اس کی ذلت وخواری کی وجہ صرف اور صرف یہی ہے اور خالق کائنات کا یہ قانون اٹل ہے کہ جو بھی حق وصداقت سے منہ موڑے گا، ذلت وخواری اس کا مقدر ٹھہرے گی۔ وَلَنُ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبُدِيُلًا.

..................o..................